رضا علی عابدی

ٹین کا خالی ڈِبّا

خدا خدا کر کے اسکول کی عمارت کا مسئلہ حَل ہوا اور اُس نے میرے خواب میں آنا چھوڑا۔ مگر ٹین کے ڈِبّے کا مسئلہ کسی حال حَل ہونے کو نہیں آتا۔ وہ بد ستور خواب میں آئے چلا جاتا ہے۔ اسکول کا تو یہ تھا کہ اس کے در و دیوار نظر آتے تھے۔ ٹین کا ڈبّا نظر نہیں آتا، خواب میں اس کی صرف آواز آتی ہے۔

اسکول میرے لڑکپن کا اسکول تھا۔ کیسی اچّھی سرخ اینٹوں اور سرخ کھپریلوں کی عمارت تھی۔ کیسے اچّھے سرخ اینٹوں کے فرش اور گلاب اور گیندے کی کیاریاں تھیں۔ کیسے اچّھے کلاس روم، کتنا عمدہ بڑا سا ہال اور کیسا گھنا وہ درخت تھا جس کے نیچے ہر صبح سارے لڑکے قطار بنا کر کھڑے ہوتے تھے اور ''سارے جہاں سے اچّھا ...'' گایا کرتے تھے۔ کسی کے سُر اِدھر جاتے تھے اور کسی کی تان اُدھر لیکن اچّھا لگتا تھا۔

اس کے بعد چوتھی جماعت کے ٹیچر مسٹر سائمن صبح کے اخبار کی خاص خاص خبریں پڑھ کر سناتے تھے۔ انھوں نے جاپان کے کسی جزیرے پر ایک ایسے بَم کے گرنے کی خبر سنائی تھی جو صرف ایک ذرّے سے بنا تھا لیکن جس نے پورا جزیرہ تباہ کردیا تھا اور ساری آبادی کو مار ڈالا تھا۔

وہ ہیڈماسٹر کے کمرے کی چھت کے اوپر لگا ہوا گھنٹہ جو سنا ہے کہ انجنیئرنگ کالج کے لڑکوں نے ڈھالا تھا۔ وہ بڑا سا کھیلوں کا میدان جس میں سنا ہے کہ ایک بار کوئی ہوائی جہاز اُتر آیا تھا۔ دوسری جانب ہاسٹل کی عمارت اور چاردیواری کے پچھواڑے وہ کچّی سڑک جس پر دھول اُڑاتی ہوئی بیل گاڑیاں گنّے لادے گزرا کرتی تھیں۔

وہ سب میرے وجود سے چمٹا چمٹا چلا آیا اور اسکول نے ہر رات خواب میں آنا شروع کر دیا۔ کبھی یوں نظر آتا کہ عمارت میں توسیع ہو رہی ہے۔ کبھی دکھائی دیتا کہ ایک بالائی منزل بھی بن گئی ہے۔ بس جب بھی نظر آئی، ترقّی ہی نظر آئی۔

پورے ۳۵ سال بعد جب میں واپس گیا اور اسکول کے زمانے کے دوستوں سے ملا تو کوئی گنجا ہو چکا تھا، کسی کی کمر جُھک گئی تھی، کسی کے بال سفید ہو گئے تھے اور

چشمہ توہر ایک نے لگا رکھا تھا۔ جب اچّھی طرح گلے مِل چکے اور دوستوں کی بیویوں نے پوچھا کہ کیا کھائیے گا، اُس وقت میرے جواب نے انھیں حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے کہا کہ خدا کے لیے پہلے چل کر مجھے اسکول دکھادو۔ ایک بار دیکھ لوں تو شاید وہ خوابوں میں آنا چھوڑ دے۔

جہاں ہم سب صبح صبح پیدل جایا کرتے تھے اور سہ پہر کو پیدل لَوٹا کرتے تھے، اُس روز سب کاروں میں بھر کر وہاں گئے۔ کاروں میں ہم سب اور آگے پیچھے، دائیں بائیں اسکوٹروں پر دوستوں کے جوان بیٹے۔

جا کر اسکول دیکھا۔ کاش نہ دیکھا ہوتا۔ وہ ٹوٹ چکا تھا، پھوٹ چکا تھا۔ نہ توسیع ہوئی تھی، نہ دوسری منزل بنی تھی، بلکہ بڑے ہال اور سائنس روم کی چھتیں گر چکی تھیں، حیران ہوں کہ انھیں کیا ہوا؟

ہاں مجھے یہ ہوا کہ وہ دن اور آج کا دن، پھر کبھی اسکول خواب میں نہیں آیا۔ شاید ہم دونوں نے ایک دوسرے کا پیچھا چھوڑ دیا۔ اس طرف سے اطمینان ہوا اور میں چین سے سونے لگا، مگر اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس ٹین کے ڈِبّے کا کیا کروں۔

جاڑوں کی رات تھی اور جاڑے بھی لندن کے۔ ایک تو پت جھڑ، اوپر سے رات کی تیز ہوائیں۔ سڑک کی پیلی پیلی روشنیاں دھندلائی ہوئی سی تھیں اور باہر سنّاٹا پڑا تھا۔ ہوا کا شور تو کم تھا البتّہ سوکھے پتّے اُڑنے کی آواز یوں آ رہی تھی‌جیسے کوئی مجمع اپنی مرضی کے خلاف تالیاں بجا رہا ہو۔ نہ کسی کے قدموں کی آواز تھی، نہ کتّے بھونک رہے تھے اور وہ جو رات کے دوران اِکّا دُکّا کاریں گزر جاتی ہیں اُس رات وہ بھی نہیں گزر رہی تھیں۔

اتنے میں کہیں سے ایک آواز آئی۔ گلی کے ایک سرے سے ٹین کے ایک خالی ڈِبّے نے لُڑھکنا شروع کیا۔ ہوا تیز ہوتی تو وہ بھی تیزی سے لڑھکتا۔ ہوا سست پڑ جاتی تو وہ بھی ذرا سا سرک کر رہ جاتا۔

اس کی آواز سے یہی گُمان ہوتا تھا کہ خالی ہے لیکن شاید اُس کے اندر تھوڑا سا پانی وانی بھرا ہوا تھا کیونکہ اس کی آواز ذرا ذرا بوجھل تھی۔ کبھی ٹین کا ڈِبّا تنہا لڑھکنے کی آواز آتی۔ کبھی کبھی صرف پتّے اڑنے کا شور ہوتا۔ پھر ذرا دیر کے لیے ان دونوں کی آوازیں اِکھٹّی آئیں۔

ایک بار آواز سے یوں لگا کہ ڈِبّا لڑھکتے لڑھکتے سوکھے پتّوں کی کسی ڈھیری میں

پھنس گیا ہے۔ اِک ذرا ذرا سی آنے والی آواز سے صاف یوں لگتا کہ وہ ڈھیری سے نکلنے کے جَتن کر رہا ہے۔ پھر ایک تیز جھونکا آیا۔ بہت سے پتّے اڑے اور مجھے محسوس ہوا کہ ڈِبّے کو رہائی مِل گئی ہے۔ اب وہ تیزی سے لڑھکتا ہوا میرے گھر کے سامنے آ پہنچا۔ بہت جِی چاہا کہ اٹھ کر اور کھڑکی کا پردہ سرکا کر اُسے دیکھوں مگر پھر یہ سوچ کر اپنے اوپر ہنسی آئی کہ ایک اچّھا بھلا شخص ٹین کا خالی ڈِبّا دیکھنے کے لیے گرم گرم بستر سے نکلا ہے۔

شاید ہوا کا رُخ بدلا، یا خدا جانے کیا ہوا، ڈِبّا وہیں رُک گیا۔ ہوسکتا ہے وہ جو بِلّیاں گھروں کی دہلیزوں کے باہر رکھی ہوئی دودھ کی خالی بوتلوں کی گردنوں پر جَما ہوا باسی دودھ رات بھر چاٹتی پھرتی ہیں، وہ ڈِبّے کو چاٹ رہی ہوں۔ مگر کوکا کولا سے بلّیوں کو کیا دلچسپی۔ ممکن ہے بئیر کا ڈِبّا ہو۔ مگر کیا بلّیاں بئیر پی لیتی ہیں؟ مشکل ہی ہے، لیکن برطانیہ کی بلّیوں کا کیا اعتبار۔

ایک بار ہم نے قورمے کی بچی ہوئی بوٹیاں باہر ڈال دی تھیں، بلّیاں حقارت سے سونگھ کر آگے بڑھ گئیں۔ پھر ایک روز جب اسکاٹ لینڈ کی گائے کے گوشت کا بچا ہوا اسٹیک باہر ڈالا تو بلّیوں نے تمام رات دھینگا مُشتی مچائے رکھی۔

میری سوچوں سے بے نیاز ٹین کے خالی ڈِبّے نے ایک جست سی بھری اور ہوا کے سرد جھونکوں کے ساتھ لڑھکتا لڑھکتا آگے نکل گیا۔ کبھی سوکھے پتّے آگے ہوتے تھے، کبھی وہ خود۔ میں سوچنے لگا کہ گلی کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر وہ کیا کرے گا۔ بائیں جانب مڑے گا یا بڑی سڑک پار کر کے دوسری طرف اُتر جائے گا۔

اب اُس کے جانے کی آواز مدّھم پڑتی جا رہی تھی مگر پتّوں کے شور کے باوجود صاف تھی۔ اتنے میں باہر گلی میں تیز روشنی آئی۔ جدھر سے ڈِبّا آرہا تھا اُدھر سے ایک کار آئی۔ سوکھے پتّوں کو کچلتی ہوئی وہ میرے گھر کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گئی۔ پھر یوں لگا کہ گلی کے دوسرے کنارے پر وہ ایک لمحے کو رُکی اور کہیں چلی گئی۔

مگر اس کے بعد ایک عجیب بات ہوئی۔ ٹین کے خالی ڈِبّے کے لڑھکنے کی آواز آنی بند ہو گئی۔ جھونکے بھی آئے، پتّے بھی اُڑے لیکن ڈِبّے نے جیسے چُپ سادھ لی۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ جب سب کچھ چَل رہا ہے تو ڈِبّے کا لڑھکنا کیسے رُک سکتا ہے۔

میں نے لِحاف اُلٹا، بستر سے باہر نکلا اور کھڑکی کا پردہ اٹھا کر اُس طرف دیکھا جِدھر ڈِبّا گیا تھا لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ ہر طرف پتّے ہی پتّے اڑ رہے تھے۔ خیال تھا کہ ان

کی آڑ سے ڈِبّا جھانکے گا۔ مگر اسے کیا پڑی تھی جو جھانکتا۔

کیا ہوا؟ میں سوچنے لگا۔ کہیں وہ کار اسے کُچلتی ہوئی تو نہیں گزر گئی؟ میں اور سوچنے لگا۔

میرا سوچنا نہ تھما۔ رات کا ڈھلنا بھی نہ تھما۔ ذرا سی روشنی ہوئی تھی کہ میں نے لپک کر گاؤن پہنا، سلیپریں پہنیں، دروازہ کھولا، اور باہر نکل کر وہاں جا پہنچا جہاں میرا خیال تھا کہ کار نے ڈِبّے کو کُچلا ہوگا۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ کچھ سوکھے پتّے تھے، انھیں میں پیر سے ہٹانے لگا۔ پھر بھی کچھ نہ نکلا تو میں نے پہلے ایک ہاتھ سے، پھر دونوں ہاتھوں سے پتّے ہٹانے شروع کیے۔ نیچے سے اُجلی سڑک نکل آئی لیکن ٹین کا ڈِبّا نہ نکلا۔ میں سڑک کے ساتھ ساتھ دور تک گیا، موڑ تک پہنچا۔ اِدھر اُدھر دیکھا مگر ڈِبّا کہیں نہ ملا۔

واپس آکر میں نے چائے بنائی، ایک دن پرانا اخبار پڑھا اور دیر تک پچھلی کھڑکی سے باغ کو دیکھتا رہا۔ ڈِبّے کے یوں غائب ہوجانے کی گُتّھی سُلجھنے کے بجائے اُلجھتی جا رہی تھی۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ جو کار گزری تھی اور گلی کے سِرے پر ایک لمحے کو رکی تھی اس میں وہ آدمی بیٹھا ہو جو کمسن بچّوں کو اُٹھا لے جاتا ہے، اُن پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے اور پھر انھیں مار کر لاش کہیں پھینک دیتا ہے۔

ذہن نے اتنا سوچا اور بالآخر سوچنا خود ہی چھوڑ دیا۔ نیا اخبار آگیا اور دن کے معمولات شروع ہوگئے۔

یہاں تک تو غنیمت تھا۔

اس کے بعد سے اب یہ حالت ہے کہ اکثر رات کو ایک خواب کہیں سے آجاتا ہے۔ اس خواب میں نظر کچھ نہیں آتا، صرف آوازیں آتی ہیں، ہوا کی آوازیں، سوکھے پتّے اڑنے کی آوازیں اور ایک ڈِبّے کے لڑھکنے کی آوازیں۔ ٹین کے خالی ڈِبّے کی!

اب سوچتا ہوں کہ کوئی مجھے وہ ڈِبّا دکھا دے۔

کُچلا ہوا ہی سہی!